ڈاکٹر تبسم کاشمیری

اورل ہسٹری (Oral History) اور اردو ادب

e present article aims to discuss the importance of *oral* story in Urdu leterature; its need, significance and important sues. The article discusses its importance in the history of erature and its future prospects.

❖•❖•❖•❖•❖•❖•❖

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں یورپ کے دو مورخین نے کہ جن پر جرمن تاریخ نگاری کا اثر تھا یہ تصور پیش کیا تھا کہ تاریخ کو مکمل طور پر اسناد پہ مشتمل ہونا چاہیے۔ دستاویزی ماخذوں کے بغیر تاریخ نگاری کا وقار قائم نہیں ہوسکتا ہے۔ان حضرات کی مشہور کتاب "An Introduction to the Study of History" اس دور کی مقبول کتاب تھی اور آنے والے ادوار میں تاریخ نویسی پر اس کتاب کو معتبر قرار دیا گیا اور مورخین اس سے استفادہ کرتے رہے۔ یہ کتاب ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی تھی اور تاریخی اثباتیت (Historical Positivism) کے ماننے والوں کے لیے رہنما کتاب بن گئی تھی ۔ مصنفین کا دعویٰ تھا کہ مورخین کا کام دستاویزات پر مشتمل ہوتا ہے ۔اگر ان کے پاس دستاویزات نہیں ہیں تو پھر تاریخ بھی نہیں ہے۔ تاریخ نویسی کے اس تصور نے بیسویں صدی کے برطانوی مورخین کو بھی متاثر کیا۔

تاریخ کے مندرجہ بالا سخت اصولوں کے سبب اورل ہسٹری (Oral History) کو اہمیت نہ مل سکی۔ یہ انیس سو ساٹھ کی دہائی تھی جب اورل ہسٹری کو علمی وقار

Scanned by CamScanner

حاصل ہونا شروع ہوا اور بعد ازاں مورخین نے اس کے حدود اور ضوابط پر کام شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی قوموں نے سماجی تاریخ کی طرف خصوصی توجہ دی اور اس مقصد کے لیے اورل ذرائع کا کثرت سے استعمال کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اورل ہسٹری کو زیادہ اہمیت ملی۔ اس دور میں یونیورسٹیوں کے کثیر التعداد مورخین نے اورل ماخذوں کو کثرت سے تحقیقی کام میں استعمال کرنا شروع کیا۔ اورل ہسٹری کے مشہور مورخ پال تھامپسن (Paul Thompson) نے بہ ذات خود اور اپنے رفقا کی اعانت سے زبانی شہادتوں کی فراہمی کے لیے معیارات کا تعین کیا۔

عصر حاضر میں سماجی اور ثقافتی تاریخ سے دل چسپی بڑھنے کے سبب سے اورل ہسٹری کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ آج کل برطانیہ کی Oral History Association اپنا جرنل شائع کرتی ہے۔ امریکہ سے بھی International Annual of Oral History شائع ہوتا ہے۔ امریکہ ہی سے Oral Hisory Review اور Oral History Recorder بھی شائع ہوتے ہیں۔(۱)

ہمارے اس جدید دور میں اورل ہسٹری کی طرف خاص طور پر توجہ دی جا رہی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جنرل ہسٹری جن باتوں کو بیان کرنے سے قاصر نظر آتی ہے وہاں اکثر اوقات اورل ہسٹری معاونت کرتی ہے۔ تاریخ کے بہت سے تاریک گوشے اورل ہسٹری کی مدد ہی سے روشن ہوسکتے ہیں۔ خاص طور پر تاریخ کے وہ شعبے کہ جن کا تعلق عوامی زندگی سے ہوتا ہے ان کے لیے تاریخ کا یہ طریقہ کار کافی معلومات فراہم کرتا ہے۔ جنرل ہسٹری تاریخ باضابطہ طور پر واقعات و حالات اور کوائف کو ارتقائی صورت میں پیش کرتی ہے۔ یہ ہر دور کی کامیابیوں، ناکامیوں، حاصلات، فتوحات اور بڑے بڑے کارناموں کو سامنے لاکر اس دور کی تصویر بناتی ہے۔ جنرل ہسٹری کسی خاص دور کی شکست وریخت اور انقلابی عمل کے باعث عام آدمی سے گزرنے والے مصائب اور اس کے ذاتی

Scanned by CamScanner

تجربات کو ہم تک نہیں پہنچا سکتی ہے۔ یہ کام بھی اورل ہسٹری ہی انجام دیتی ہے۔ میں اس مسئلہ پر کچھ دیر بعد آپ سے مفصل باتیں کروں گا مگر اس مقام پر ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا حوالہ دے کر اس بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ سن ستاون کے انقلاب کے بارے میں دانش گاہوں کی الماریاں بھری پڑی ہیں۔ انگریزوں نے Sepoy War کے حوالے سے اور ہندوستانیوں نے آزادی کی جنگ کے حوالے سے اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس کو پڑھنے کے لیے بھی برس ہا برس کی ضرورت ہے۔ دلی، لاہور، جھانسی، لکھنو اور دیگر مقامات کے محاربات پر وافر مقدار میں معلومات مل جاتی ہیں۔ اس دور کی جنرل ہسٹری میں تفصیل کے ساتھ بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ اس بڑے انقلاب کے عمل میں عام انسانوں پر کیا گزری انہوں نے کن قیامت خیز حالات کا سامنا کیا اور کس طرح سے وہ لوگ تباہ و برباد ہوئے تو جنرل ہسٹری ان معاملات پر بہت کم روشنی ڈالتی ہے۔ اسی طرح سے دلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور اس کے خاندان کے شہزادوں کے ساتھ کیا بیتی اور انہوں نے اس انقلاب کے درد کو کس طرح محسوس کیا تو اس کا جواب بھی ہم جنرل ہسٹری میں نہیں بلکہ اورل ہسٹری ہی میں تلاش کرتے ہیں۔ بہرحال اس کے بارے میں آنے والے صفحات میں کچھ عرض کروں گا۔ فی الحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اورل ہسٹری کا مواد مختلف شکلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ مواد ذاتی بیانات، مضامین، خطوط، روزنامچوں، خود نوشت، تاریخی واقعات کی چشم دید شہادتوں، انٹرویوز اور تاریخی قصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں سنی سنائی روایات کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ کسی دور کی اورل ہسٹری لکھتے ہوئے ہم اس نوعیت کے مواد کو ہو بہو قبول نہیں کرتے بلکہ دستاویزی تحقیق کے خارجی اور داخلی طریقہ کار سے اس مواد کی صداقت کو بھی پرکھتے ہیں۔ اس لیے اورل ہسٹری اگرچہ جنرل ہسٹری نہیں ہے مگر اس کی جانچ پرکھ میں جنرل ہسٹری کے قواعد سے کام لیا جانا چاہیے۔

میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اورل ہسٹری کے بارے میں اگرچہ بہت سے لوگ

Scanned by CamScanner

اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں مگر اورل ہسٹری کی کوئی حتمی اور متعینہ تعریف کا فیصلہ نہیں ہوسکا ہے اس کا اعتراف اورل ہسٹری کے بزرگ مورخ Ken Hawarth نے بھی کیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جنرل ہسٹری میں جہاں جہاں ضرورت پڑے اورل ہسٹری کا مناسب استعمال تاریخ کے تاریک اوراق کو منور کرنے کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔

میں نے اس بات چیت کے آغاز میں یہ عرض کیا تھا کہ میرا موضوع اردو ادب اور اورل ہسٹری ہے اس لیے اب میں آپ کے سامنے کچھ مثالیں پیش کر کے اورل ہسٹری کا عمل دکھاؤں گا اور یہ بتاؤں گا کہ اورل ہسٹری تاریخ کے خلاؤں کو کیسے پر کرتی ہے۔

میں اس سلسلہ کلام کو تیرہویں صدی کے شاعر اور صوفی حضرات امیر خسرو سے شروع کروں گا۔ امیر خسرو و ہند اسلامی تہذیب کی ایک اساطیری شخصیت ہیں۔ ان کی فارسی شاعری اور ان کے صوفیانہ تشخص نے ان کو ایک لازوال مقام عطا کر رکھا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کی تیرہویں اور چودہویں صدی میں اردو دب کی مثالیں نہیں ملتی ہیں اگرچہ ایک روایت کے مطابق گیارہویں صدی کے فارسی شاعر مسعود سعد سلمان لاہوری کے ہندوی دیوان کا ذکر خود امیر خسرو نے کیا ہے مگر مسعود سعد کے اس دیوان کا صرف حوالہ ہی ملتا ہے۔ آج تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ لیکن مسعود سعد کے بعد تیرہویں صدی کے شاعر امیر خسرو کے ہاں ہندوی یا اردو کلام ضرور مل جاتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کلام کی لسانی ساخت کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اس کا تعلق تیرہویں، چودہویں صدی کی زبان سے ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ مخطوطات کی صورت میں خسرو کا جو کلام ان کے نام سے ملتا ہے اس کا زمانہ گزشتہ دو ڈھائی سو برسوں پر محیط ہے اس سے قبل کلام کے آثار نہیں ملتے ہیں۔ اس لیے اردو تحقیق کے بیشتر اہم محقق خسرو سے منسوب کلام کی حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر ان کی اس بات کو مان لیا جائے تو اردو

Scanned by CamScanner

ادب اپنے ایک اہم تاریخی کردار سے مرحوم ہوسکتا ہے اور اس طرح اردو ادب کی قدامت کو بھی ضعف پہنچ سکتا ہے۔ خسرو کی شخصیت برصغیر میں بے حد مقبول رہی ہے ان کی شخصیت کے ساتھ Oral Tradioun کا بھی تعلق ہے ۔اس حوالے سے خسرو Folk Lore جیسی حیثیت بھی رکھتے ہیں اس طرح ان کا کلام فوک لور کا مقام بھی رکھتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ برصغیر کے عوامی حافظے میں خسرو کا کلام صدیوں سے موجود رہا ہے اور لوگ نسل در نسل اسے آگے منتقل کرتے چلے آئے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ اس طویل انتقال کے باعث جو کئی نسلوں پر مشتمل ہے خسرو کا کلام ہر نئے دور میں منتقل ہوتے وقت اس دور کی زبان اور لسانی تبدیلیوں کے باعث مسلسل تبدیل ہوتا رہا ہے۔ اس لیے جو کلام ہمارے سامنے موجود ہے اس پر زبان کی قدامت کی چھاپ نہیں ملتی ہے اور ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ تو پرانا کلام نہیں ہے ۔یہ اورل ہسٹری کا کام تھا کہ جس نے صدیوں تک خسرو کے کلام کو محفوظ رکھا اور اسے آنے والی نسلوں تک منتقل کیا۔ اگر ہم اورل ہسٹری کے اس کردار کی نفی کریں تو اردو ادب کی تاریخ اپنے ایک نہایت زندہ کردار سے محروم ہو جائے گی۔ اس طرح ہم اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جنرل ہسٹری یا لٹریری ہسٹری کے بعض خلایا تاریک گوشے اورل ہسٹری کی مدد سے پر کیے جاسکتے ہیں اور ان کو روشنی میں لایا جا سکتا ہے اور اس ترکیب سے تاریخ کو ہم ارتقائی عمل سے گزرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔

اردو ادب کے کچھ ایسے کردار بھی ہیں کہ جن کی تشکیل میں اورل ہسٹری کا خاص کردار پایا جاتا ہے ۔اب آیئے ہم کچھ دیر کے لیے شمالی ہند کا سفر کرتے ہیں۔ جہاں ٹائم ٹنل (Time Tunnel) میں ہماری ملاقات گولکنڈہ سلطنت کے ایک خوب صورت داستانی کردار سے ہوتی ہے۔ یہ ''بھاگ متی'' ہے۔ قطب شاہی دور کے سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء۔۱۶۱۱ء) کی دل نواز خوب رو محبوبہ۔ جس کے نام پر محمد قلی قطب نے ''بھاگ نگر''

Scanned by CamScanner

شہر بسایا تھا اور بعد ازاں اس شہر کا نام تبدیل کر کے ''حیدر آباد'' رکھ دیا گیا تھا۔ اورل ہسٹری یہ بتاتی ہے کہ بھاگ متی گولکنڈھ کے نزدیکی گاؤں چچلم کی ایک رقاصہ تھی۔ محمد قلی قطب اپنی جوانی کے آغاز میں اس پر عاشق ہوا اور چچلم کے چکر لگانے لگا۔ ایک بار برسات کا زمانہ تھا موسی ندی میں طغیانی تھی ۔ یہ شام کا وقت تھا۔ نوجوان شہزادہ محمد قلی قطب اپنی محبوبہ کے عشق میں سرشار تھا اور ہر قیمت پر وہ شام چچلم میں گزارنا چاہتا تھا۔ عشق کے جنون ہی میں اس نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈالا اور طوفان سے کھیلتا ہوا چچلم جا پہنچا۔ جہاں اس کی دل نواز محبوبہ اس کا شوق سے راستہ دیکھ رہی تھی ۔ دوسرے روز جب شہزادے کے باپ سلطان ابراہیم قطب شاہ کو شہزادے کی رومانوی مہم کا علم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ موسی ندی پر ایک عمدہ پل تیار کر دیا جائے۔ سلطان سمجھتا تھا کہ نوجوان شہزادہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہے اس لیے کسی طوفانی حادثہ کا شکار ہوسکتا ہے اس نے بیٹے کو عشق سے نہیں روکا بلکہ عشق کے سفر کو آسانی سے طے کرنے کے لیے پل کی تعمیر کا حکم دے دیا تھا۔ بھاگ متی اور محمد قلی قطب شاہ کے عشق کی یہ داستان نسل در نسل اورل ہسٹری ہی کے ذریعے ادبی تاریخ کے اوراق تک پہنچی ہے ۔ محمد قلی قطب جب ۱۵۸۰ء میں گولکنڈہ کا سلطان بنا تو اس نے اپنی محبوبہ کی قدر و منزلت میں بہت اضافہ کیا۔ سلطان نے ایک ہزار سوار اس کے سپرد کر رکھے تھے اور وہ ان سواروں کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے دربار میں آیا کرتی تھی۔ ہم عصر مورخ فرشتہ نے یہ کہا ہے کہ سلطان نے ''بھاگ نگر'' کے نام سے جو شہر آباد کیا تھا بعد میں اس کا نام حیدر آباد رکھ دیا تھا۔ دکن کے ممتاز مورخ ہارون خان شروانی نے بھاگ متی کے تاریخی وجود کو تسلیم نہیں کیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ شروانی کی ساری تحقیق بھاگ متی کی متھ (Myth) کو نہیں توڑ سکی۔(۲)

دراصل اورل ہسٹری کے وہ واقعات جن میں رومانس ہو وہ نہایت فرحت بخش اور مسرت انگیز ہوتے ہیں اس لیے عوامی حافظہ کبھی بھی ان واقعات کے رومانس کو اپنے

Scanned by CamScanner

آپ سے الگ کرنا پسند نہیں کرتا۔ گزشتہ سال ٦۔فروری کو جب میں اور پروفیسر مستنصر
حیدر آباد دکن میں تھے تو ہم نے حیدر آباد کے نزدیک قلعہ گولکنڈہ کی بھی سیر کی۔ پتھر
بناہوا یہ قلعہ اب کھنڈرات کی شکل میں موجود ہے۔ بہت کم عمارتیں باقی ہیں۔ ان ہی باقی
ماندوں عمارتوں کے قریب چلتے ہوئے ایک مقام پر ہمارا گائیڈ رک گیا تھا۔ اس نے ہاتھ
کے اشارے سے پتھر سے بنی ہوئی بڑی بڑی کھڑکیوں کی طرف دیکھ کر بتایا تھا کہ ان کے
درمیان جھولے لٹکا دیئے جاتے تھے جہاں شہزادیاں اور رقاصائیں جھولے جھولتی تھیں۔ اس
وقت میں نے فوراً ہی اپنی چشم تصور میں یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس مقام پر برسات کی آمد پر
زیریں حوض رنگوں سے بھر دیئے جاتے تھے اور در و دیوار پھولوں سے سجائے جاتے تھے اور
اسی مقام پر بھاگ متی اور دوسری محبوبائیں پھول پھینکتی تھیں رنگ گراتی تھیں اور برسات
کے گیت گاتی تھیں۔ایسے موقعوں پر محمد قلی قطب شاہ نے اپنی محبوباؤں کے حسن کی بہت
تعریف کی ہے میں یہاں کچھ حصے درج کر کے اس کے جمالیاتی ذوق کا رنگ پیش
کروں گا:

"ان نئی نئی اور شوخ دوشیزاؤں نے اپنی چولیاں پانی کی بوندوں
سے بھگولی ہیں اور جھولوں میں جھول رہی ہیں۔"

"ان چھبیلی پتلیوں جیسی دوشیزاؤں کے جوبن چولیوں کے بند سے
آزاد ہو کر نکل پڑے ہیں۔ جس سے شراب عشق ابل رہی ہے اور
وہ اپنی آنکھوں سے فریفتہ بنا رہی ہیں۔"

ادب میں اورل ہسٹری کی تلاش میں ہم اب برصغیر کے جنوب سے شمال کی
طرف مغلیہ دور کے تاریخی شہر لاہور میں آتے ہیں۔ جہاں حکومت پنجاب کے دفاتر کے
نزدیک پرانی وضع کا ایک مقبرہ نظر آتا ہے۔ اینٹ، چونے اور گارے سے بنی ہوئی اس
عمارت میں پنجاب آرکائیوز کے کا... ... خلا ہوا... تو دائیں

بائیں پرانے فرمان، تصاویر اور دستاویزات نظر آتی ہیں اور عمارت کے بائیں حصے میں سنگ مرمر سے بنا ہوا ایک تعویذ ملتا ہے جس پر ۹۹ اسمائے الٰہی کندہ ہیں۔ قبر کے کتبہ پر کسی قسم کی تاریخی عبادت درج نہیں ہے صرف یہ شعر لکھا ہے:

آہ گر من باز بینم روئے یار خویش را
تا قیامت شکر گویم کرد گار خویش را

اور آخر میں لکھا ہے ''مجنون سلیم اکبر'' سال وفات ۱۵۹۹ ہے۔

یہ عمارت اور اس عمارت میں دفن شدہ عورت اردو ادب میں اورل ہسٹری کی سب سے مشہور رومانوی مثال ہے۔

عجیب بات ہے کہ مغلیہ دور کی کسی بھی تاریخ میں اس مقبرے میں دفن شدہ خاتون کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ یہ خاتون اورل ہسٹری میں ''انارکلی'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ''انارکلی'' کون تھی ؟ اس کی کہانی کیا تھی؟ اس کا انجام کیا ہوا؟ مغلیہ عہد اس قسم کی کوئی دستاویزی شہادت فراہم نہیں کرتا۔ انارکلی کے بارے میں اورل شہادتیں اس دور سے کاغذ پر نظر آنے لگتی ہیں جب سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں یورپین سیاح اور تاجر لاہور آ کر اس کہانی کو سنتے ہیں متاثر ہوتے ہیں اور پھر اسے اپنے ذاتی ریکارڈ میں درج کر کے ایک شہادت مہیا کرتے ہیں۔ ان ہی شہادتوں کا جائزہ لے کر اور لاہور میں اورل ہسٹری کے بیانات سن کر انیسویں صدی کے آخر میں'' تاریخ لاہور'' کے مصنف سید محمد لطیف نے انارکلی کے بارے میں یہ بیان درج کیا ہے کہ انارکلی وہ خطاب تھا جو اکبر کے حرم سرا کی پسندیدہ کنیز نادرہ بیگم یا شرف النساء کو دیا گیا تھا۔ ایک دن اکبر بادشاہ جب ایک ایسے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا جہاں آئینوں کی قطاریں لگی ہوئیں تھیں اور نوجوان انارکلی اس کی خدمت پر مامور تھی۔ اس نے آئینوں میں اس کا عکس دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ بادشاہ نے اس بات کو مجرمانہ عمل

Scanned by CamScanner

قرار دے کر یہ حکم دیا کہ اسے زندہ دفن کر دیا جائے۔ شاہی احکام کی تعمیل کی گئی۔ انارکلی کو ایک بلند جگہ پر کھڑا کر کے اس کے چاروں طرف پختہ اینٹوں کی چنائی کر دی گئی اور یوں انارکلی کو دیواروں میں زندہ دفن کر دیا گیا۔(۳) انارکلی کی یہ نہایت الم ناک کہانی اورل ہسٹری کی شکل میں تین صدیوں سے زیادہ مدت تک عوامی حافظے میں محفوظ رہی اور ایک سچی داستان کے طور پر لوگ اسے سنتے رہے۔ اس الم ناک رومانوی داستان کو عروج بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ملا جب لاہور کے نوجوان ڈرامہ نگار امتیاز علی تاج نے اسے ایک ادبی ڈرامے کی شکل میں منتقل کر دیا۔ یہ ڈرامہ اپنی نفیس ادبی زبان ڈرامائی عناصر اور بالخصوص ایک الم ناک انجام کے باعث پورے برصغیر میں بے حد مقبول ہوا۔ امتیاز علی تاج نے اس المیہ کہانی کے ڈھانچے کی بنیاد پر رومانوی ڈرامہ پیدا کیا تھا۔ یوں اس میں اورل ہسٹری میں بیان شدہ اصل کہانی موجود ہے۔ انارکلی کی داستان میں اتنا تاثر تھا کہ سن پچاس کی دہائی میں ہندوستان کی سب سے بڑی تاریخی فلم ''مغل اعظم'' اسی داستان کے پس منظر میں بنائی گئی تھی۔ اس کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں اس کہانی پر دو اور فلمیں بھی بنائی گئیں اور آج برصغیر پاک و ہند میں اورل ہسٹری کی سب سے اہم مثال 'انارکلی' سمجھی جاتی ہے۔ برصغیر کے عوام میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس داستان سے واقف نہ ہوں گے۔

برصغیر کے لوگ رومانوی داستان اور خاص طور پر المیہ داستانوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں اسی قسم کی ایک اور داستان مرزا غالب اور ان کی محبوبہ کے بارے میں ہے وہ بھی بھاگ متی اور انارکلی کی طرح رقاصہ تھی۔ یہ داستان بھی اورل ہسٹری ہی کی دین ہے۔ غالب کے خطوط میں چند ایسے اشارے موجود ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عالم شباب میں اس نے ایک رقاصہ سے عشق کیا تھا جو بہت جلد مر گئی تھی اور اس کے مرجانے کا زخم بیس سال بعد تک بھی ہرا رہا تھا۔ اس کی موت پر غالب نے ایک مرثیہ

Scanned by CamScanner

نما غزل لکھی تھی جو ان کی شاہکار غزلوں میں شمار کی جاتی ہے۔ غالب کے عشق کا یہ واقعہ اورل ہسٹری کے طور پر تقریباً ڈیڑھ سو برس تک محفوظ رہا۔ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں اردو کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے اپنی کہانیوں میں اسے ایک داستانی شکل دے کر ابھارا۔ اس واقعہ کی بنیاد پر اس نے چند دوسرے کردار بھی تخلیق کیے اور اس طرح غالب کے رومانس کو ازسرنو زندہ کر دیا۔ منٹو کے بنائے ہوئے تانے بانے کی بنیاد پر انیس سو پچاس کی دہائی میں مرزا غالب کے نام سے سیراب مودی نے ایک فلم بنائی جو بہت مقبول ہوئی۔ اورل ہسٹری کی یہ داستان برصغیر میں اتنی مقبولیت رہی ہے کہ ۱۹۴۰ء میں ایک اور فلم لاہور میں بنائی گئی۔ مگر اس داستان کی شہرت اور مقبولیت میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب ہندوستان کے معروف ہدایت کار گلزار نے ایک طویل ٹیلی وژن سیریل غالب کی زندگی پر تیار کی۔ اس سیریل میں غالب اور رقاصہ کا معاشقہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

اپنی اس بحث کے دوسرے حصے میں اب میں ۱۸۵۷ء اور اردو ادب میں ملنے والی اورل ہسٹری کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ چوں کہ صرف ایک برس بعد ستاون کے انقلاب کو ڈیڑھ سو برس ہونے والے ہیں اس لیے اس موضوع پر گفتگو برمحل معلوم ہوتی ہے اور یہ طویل مدت گزرنے کے بعد اب ہمیں اس مواد کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے جو کہ اس موضوع پر اورل ہسٹری مہیا کرتی ہے۔ اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے تاریخ کے سلسلے میں چند باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ میری مراد یہاں جنرل تاریخ کے عام کردار سے ہے۔

تاریخ کے بہت سے واقعات، حقائق، حالات و حادثات کسی دور کے مخصوص حالات کے باعث تاریکی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ کسی دور کے حکمرانوں کے خوف، جبر، جانی و مالی نقصان اور اشاعتی پابندیوں کی وجہ سے بے شمار مسائل تاریخ کے پردے میں چلے جاتے ہیں۔ چوں کہ حکمرانوں کی حکمت عملی کے سبب سے تاریخ کے صرف وہی پہلو نمایاں

Scanned by CamScanner

کیے جاتے ہیں جو ان کی حکم رانی کا جواز فراہم کرتے ہیں اور ان کے عہد کی ظاہری صداقت کو سامنے لاتے ہیں۔اس لیے عام تاریخ کے جس حصے کو ہم بہت اہم ،مستند اور مصدقہ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ وہ درحقیقت یک رخی تصویر پیش کر رہا ہوتا ہے اور اس کا مقصد حکم ران طبقے کے وجود کو تقویت دینا اور اسے سچا ثابت کرنا ہوتا ہے۔ کیا ہم اس حقیقت کا اعتراف نہیں کر سکتے کہ عام تاریخیں کسی نہ کسی تعصب اور مقصد کی نمائندگی کرتی ہیں۔ لہذا قاری کے طور پر ہمیں بہت محتاط ہو کر تاریخ کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مطالعہ میں ہمیں اپنے عقل و فہم کو ہمیشہ روشن رکھنے اور مورخین کے استدلال اور ان کے پیش کردہ تاریخی مواد کو معروضی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے ہم کسی دور کا صحیح تاریخی شعور فراہم کرنے کی جستجو کر سکتے ہیں۔اس مقام پر اب میں برصغیر کے نوآبادیاتی دور کی تاریخ کی مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ برصغیر کے برطانوی دور کی تاریخ نویسی کا کام انگریز اور یورپین مورخ کرتے رہے ہیں۔۱۹۴۷ء تک کی تاریخ خالص برطانوی نوآبادیاتی ذہن سے لکھی گئی ہے ۔نوآباد کار تاریخ کے ایک ایک واقعہ کو اپنے مفادات اور تعصاب کی آنکھ سے دیکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ وہ تاریخ کے ساتھ انہیں اپنے گروہی مفادات کے ساتھ انصاف کرتے ہیں میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسے مورخین ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں گے کہ جنہوں نے تاریخ کو تاریخ سمجھ کر لکھا ہو۔ اصل میں یہ مورخین اپنے گروہی یا نسلی مفادات کو الگ کر کے معروضی تاریخ نویسی کے عمل کو برادشت نہیں کر سکتے تھے۔ انگریز مورخین نے سن ستاون کے واقعات میں جن مظالم کے تذکرے کیے ہیں وہ خود ساختہ اور مبالغہ انگیز بھی ہیں۔ یہ بات بالکل سچ ہے ۔برطانوی مورخین نے اپنی قوم پر ہونے والے مظالم پر بے انتہا ماتم اور چیخ و پکار کی ہے مگر سن ستاون کے انقلاب میں ہندوستانیوں پر جو کچھ بیتی اس کا ذکر کرنے سے ہر ممکن حد تک گریز کیا ہے۔ ستم یہ بھی ہے کہ اس انقلاب کے دوران اور اس کے بعد برطانوی جبر و

Scanned by CamScanner

تشدد سے گھبرائے ہوئے ہندوستانی بھی ایسی داستانوں کو بہت کم رقم کرتے تھے۔

سن ستاون میں دلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور اس کے خاندان کے ساتھ کیا کچھ بیتی؟ یہ لوگ کن مصائب کا شکار ہوئے؟ مغل شہزادے اور شہزادیاں کن الم ناک حالات سے گزرے؟ ان کو کیسی کیسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور پھر سن ستاون کے بعد ان کی زندگیاں کیسے گزریں؟ یہ وہ بہت سے سوال ہیں جو سن ستاون کے حوالے سے ہمارے سامنے آتے ہیں مگر تاریخ ان کا جواب دینے سے معذور ہے یا پھر بہت ہی اختصار کے ساتھ جواب دے سکتی ہے۔ ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں اورل ہسٹری سے رجوع کرنا ہوگا۔اردو ادب کی اورل ہسٹری میں اتفاق سے ایک ادیب نے بہت قابل قدر کام کیا ہے جو ۱۸۸۰ء میں دلی میں پیدا ہوا تھا۔ میری مراد صوفی منش ادیب خواجہ حسن نظامی سے ہے۔خواجہ حسن نظامی وہ ادیب ہیں جنہوں نے سن ستاون پر اورل ہسٹری کا سب سے بڑا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ سن ستاون کے مختلف موضوعات پر انہوں نے بارہ سے زائد ایسی کتابیں تیار کیں جن کا مواد اورل ہسٹری کے مصادر پر مشتمل تھا۔ خواجہ حسن نظامی کی نوجوانی کے دور تک سن ستاون کے مغل شہزادے،شہزادیاں یا ان کی اولادیں زندہ تھیں اور ان لوگوں کو اس انقلاب کے الم ناک حالات اچھی طرح سے یاد تھے۔ خواجہ صاحب نے ایسے لوگوں کے انٹرویو کر کے ان کو کہانیوں کی شکل میں تحریر کیا۔ یہ انتہائی درد ناک حوادث کی کہانیاں ہیں اور دلی کے شاہی خاندان کے مصائب کو سمجھنے کا سب سے اہم ذریعہ ہیں اور یہ کام اورل ہسٹری نے انجام دیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس نے سقوط دلی سے قبل ۱۹ ستمبر کو قلعہ چھوڑ دیا تھا۔ ۱۸ اور ۱۹ ستمبر کی درمیانی رات میں قلعہ کے اندر قیامت برپا تھی۔ برطانوی توپوں کے گولے قلعہ کے اندر گرنے لگے تھے۔ ان حالات میں بہادر شاہ نے مجبور ہو کر اپنے شہزادوں اور شہزادیوں کو خدا حافظ کہنے کے لیے بلایا ان میں سے ایک شہزادی کلثوم زمانی

Scanned by CamScanner

بیگم تھی۔ کلثوم زمانی بیگم کے حالات سن کر خواجہ حسن نظامی نے بیٹی ''بنت بہادر شاہ'' کے عنوان سے اس کی کہانی تحریر کی تھی۔ کلثوم زمانی بیگم کے بیان کردہ حالات ہمارے سامنے سقوط دلی کے وقت قلعہ کے دردناک حالات کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ یہ کام جنرل ہسٹری کا نہیں اورل ہسٹری کا ہے کہ اورل ہسٹری کسی خاص دور یا آشوب میں انسانی جذبات و احساسات کی زندہ تصویر پیش کرسکتی ہے:

''جس وقت میرے بابا جان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج و تخت لٹنے کا وقت قریب آیا تو دلی کے لال قلعے میں ایک افسوس ناک شور مچا ہوا تھا۔ در و دیوار پر حسرت برستی تھی۔ اجلے اجلے سنگ مرمر کے مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے۔ تین وقت سے کسی نے کچھ کھایا نہ تھا۔ زینب میری گود میں ڈیڑھ برس کا بچہ تھی اور دودھ کے لیے بلکتی تھی۔ فکر اور پریشانی کے مارے نہ میرے دودھ رہا تھا نہ کسی انا کر۔ ہم سب اسی یاس و ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ حضرت ظل سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہم کو بلانے آیا۔

آدھی رات کے وقت سناٹے کا عالم لوگوں کی گرج سے دل سہمے جاتے تھے لیکن حکم سلطانی ملتے ہی ہم حاضری کے لیے روانہ ہو گئے۔ حضور جائے نماز پر تشریف رکھتے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں تھی جب میں سامنے پہنچی۔ جھک کر تین مجرے بجا لائی۔ حضور نے نہایت شفقت سے قریب بلایا اور فرمانے لگے۔ کلثوم! لو اب تم کو خدا کو سونپا۔ قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے۔ تم اپنے خاوند کو لے کر فوراً کہیں چلی جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس آخری وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں۔ پر کیا

کروں ساتھ رکھنے میں تمہاری بربادی کا اندیشہ ہے الگ رہو گی تو شاید خدا کوئی بہتری کا سامان پیدا کر دے۔

اتنا فرما کر حضور نے دست مبارک دعا کے لیے جو رعشہ کے سبب کانپ رہے تھے اٹھائے اور دیر تک آواز سے بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے رہے۔''

''پچھلی رات کو ہمارا قافلہ قلعے سے نکلا۔ جس میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ مردوں میں ایک میرے خاوند میرزا ضیکاء الدین اور دوسرے مرزا عمر سلطان بادشاہ کے بہنوئی تھے۔عورتوں میں، دوسری نواب نور محل۔ تیسری حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن تھیں۔ جس وقت ہم لوگ رتھ میں سوار ہونے لگے صبح صادق کا وقت تھا۔ تارے چھپ گئے تھے ۔مگر فجر کا تارا جھلملا رہا تھا۔ ہم نے اپنے بھرے پرے گھر پر اور سلطانی محلوں پر آخری نظر ڈالی ۔ تو دل بھر آیا اور آنسو امنڈنے لگے ۔ نواب نور محل کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پلکیں ان کے بوجھ سے کانپ رہی تھیں اور صبح کے ستارے جھلملانا نور محل کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔''(۴)

بہادر شاہ ظفر کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹ ستمبر کو قلعہ چھوڑنے کے بعد دلی کے باہر ہمایوں کے مقبرہ میں روپوش ہو گیا تھا۔مگر ہمایوں کے مقبرے کی پناہ گاہ بنانے سے قبل وہ کہاں کہاں گیا تھا اس کی طرف ڈاکٹر مہدی حسن کی کتاب " Bahadur Shah II and the War of 1857 in Delhi" میں اشارات مل جاتے ہیں ۔مگر اس وقت بہادر شاہ ظفر کے رنج و الم ،مایوسی اور بے سروسامانی کی کیا حالت تھی۔ اس کا جواب صرف اورل ہسٹری ہی دے سکتی ہے۔مقبرہ ہمایوں میں پناہ لینے سے قبل بہادر

Scanned by CamScanner

شاہ انتہائی بے بسی کی حالت میں اپنے باطنی مرکز یعنی خواجہ نظام الدین اولیا کے مرقد پر رخ کرتا ہے جو ہمایوں کے مقبرے کے نزدیک تھا۔ بہادر شاہ درگاہ میں حاضر ہو کر روٹی طلب کرتا ہے۔ جہاں اسے خانقاہ کے سادہ طریقے کے مطابق روٹی دی جاتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی مرتب کردہ کہانیوں میں یہ منظر موجود ہے جب دلی کا آخری بادشاہ اپنی زندگی کا سب سے سادہ کھانا کھاتا ہے۔ بہادر شاہ کی زندگی کے اس آخری آزاد دن کی کہانی خواجہ حسن نظامی نے اپنے نانا شاہ غلام حسن کی روایت کے مطابق بیان کی ہے۔ شاہ غلام حسن اس وقت درگاہ کے خدام میں سے تھے، ظفر ان سے عقیدت رکھتے تھے:

> ''میری والدہ ماجدہ بروایت اپنے پدر بزرگوار حضرات شاہ غلام حسن صاحب بیان فرماتی تھیں کہ جس دن بہادر شاہ دہلی کے قلعے سے نکلے تو سیدھے درگاہ حضرت محبوب الٰہی صاحب میں حاضر ہوئے اس وقت بادشاہ پر عجیب مایوسی اور ہراس کا عالم تھا۔ چند مخصوص خواجہ سراؤں اور کہاروں کے سوا کوئی آدمی ہمراہ نہ تھا۔ فکر و اندیشے سے بادشاہ کا چہرہ اترا ہوا تھا اور گرد وغبار سفید داڑھی پر جما ہوا تھا۔ بادشاہ کی آمد سن کر نانا صاحب درگاہ شریف میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ مزار مبارک کے سرہانے در سے تکیے لگائے بیٹھے ہیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی حسب معمول بشرے کو متبسم کر دیا۔ میں سامنے بیٹھ گیا اور خیریت دریافت کرنے لگا۔ جس کے جواب میں نہایت طمانیت سے بولے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کمبخت باغی سپاہی کسی کی بات نہیں مانتے ان پر اعتماد کرنا غلطی ہے۔ خود بھی ڈوبیں گے مجھ کو بھی ڈبوئیں گے آخر وہی ہوا کہ بھاگ نکلے۔ بھائی اگرچہ میں ایک گوشہ نشین فقیر ہوں مگر ہوں اس خون کی یادگار جس

میں آخر دم تک مقابلہ کرنے کی حرارت ہوتی ہے۔ میرے باپ
داداؤں پر اس سے زیادہ برے وقت پڑے ہیں اور انہوں نے
ہمت نہیں ہاری مگر مجھے تو غیب سے انجام دکھا دیا گیا ہے۔ اب میں
اس شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ میں تخت ہند پر تیمور کی آخری
نشانی ہوں۔ مغلی حکومت کا چراغ دم توڑ رہا ہے اور کوئی گھڑی
کا مہمان ہے۔ پھر جان بوجھ کر خواہ مخواہ کیوں خون ریزی کراؤں؟
اس واسطے قلعہ چھوڑ کر چلا آیا۔''

ان مکالمات کے بعد کچھ اسلامی تبرکات درگاہ میں بہ حفاظت رکھنے جانے کے لیے پیش کیے اور پھر اپنی بھوک اور پیاس کا ذکر کیا:

''نانا صاحب سے بادشاہ نے کہا کہ آج تین وقت سے کھانے کی
مہلت نہیں ملی اگر گھر میں کچھ تیار ہو تو لاؤ نانا صاحب نے کہا ہم
لوگ بھی موت کے کنارے کھڑے ہیں۔ کھانے پکانے کا ہوش
نہیں۔ گھر جاتا ہوں جو کچھ موجود ہے۔ حاضر کرتا ہوں۔ بلکہ آپ
خود گھر تشریف لے چلیں جب تک میں زندہ رہوں اور میرے بچے
سلامت ہیں آپ کو کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکتا پہلے ہم مرجائیں گے
اس کے بعد کوئی اور وقت آسکے گا۔ بادشاہ نے فرمایا آپ کا احسان
ہے جو ایسا کہتے ہو مگر اس بوڑھے جسم کی حفاظت کے لیے اپنے
پیروں کی اولاد کو قتل گاہ میں بھیجنا مجھے کبھی گوارا نہ ہوگا۔ زیارت
کر چکا۔ امانت سونپ دی اب دو لقمے محبوبی لنگر سے کھالوں تو مقبرہ
ہمایوں میں چلا جاؤں گا۔ وہاں جو قسمت میں لکھا ہے پورا ہو
جائے گا۔

Scanned by CamScanner

ناناصاحب گھر آئے دریافت کیا کہ کچھ کھانے کو موجود ہے۔ کہا گیا کہ بیسنی روٹی اور سرکے کی چٹنی ہے۔ چنانچہ وہی ایک خوان میں آراستہ کرکے لے آئے اور بادشاہ نے وہ چنے کی روٹی کھا کر تین وقت کے بعد پانی پیا اور خدا کا شکرانہ بھیجا۔ اس کے بعد ہمایوں کے مقبرے میں جا کر گرفتار ہوئے۔"(۵)

سن ستاون کے بعد مغل شہزادوں کا انجام بہت برا ہوا۔ بے شمار شہزادوں کو شاہی خاندان کا فرد سمجھ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور جو باقی بچے وہ گم نامی اور انتہائی غربت و ناداری کی حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۱۷ء میں دلی کے ایک اخبار کے دفتر میں ایک مغل شہزادے کو دیکھا تھا جو نہایت معمولی کام کرنے پر مجبور تھا۔ انہوں نے اس شہزادے کے گھر کو بھی جا کر دیکھا تھا اس کے گھر کا نقشہ کھینچتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"شہزادہ محمود آج ایک ایسے مکان میں رہتا ہے جہاں ان کے بڑوں کا ایک کمین سے کمین غلام بھی رہنا پسند نہ کرتا۔ نہ پکی دیوار ہے نہ پکی چھت ہے نہ پکا صحن ہے۔ کچی مٹی کی دیواریں ہیں جن پر کوئلے اور ٹھیکریوں کی پچی کاری ہے اور جن پر بارش کی بوندیوں نے خاک کے دروں کو چیر چیر کر گلکاریاں بنائی ہیں۔ شہزادے محمود کو آج وہ کھانا ملتا ہے جو اس کے بزرگوں کے خدمت گاروں نے بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ سوکھی روٹیاں چٹنی سے کھالیتا ہے۔ وہ ابالی دال سے پیٹ بھر لیتا ہے اور یہ بھی میسر نہ آئے تو اپنے معصوم بچوں کو تسلی دیتا ہوا فاقے میں پڑ کر سو جاتا ہے۔ شہزادے محمود کے پاس نہ کم خواب کے کپڑے ہیں نہ زربفت کے

Scanned by CamScanner

پیوند لگے کپڑے پہنتے ہیں اور سردی آ جائے تو پھٹی ہوئی گدڑیوں
اور بوسیدہ کمبلوں کو اوڑھ کر رات بسر کرتے ہیں۔"

خواجہ حسن نظامی نے ایسے شہزادوں کو بھی دیکھا تھا جو زمانے کی گردش کے باعث بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ان کی کہانیوں میں ایک ایسے ہی شہزادے کی کہانی بھی شامل ہے جو دلی کی جامع مسجد کے قریب رہتا تھا۔ وہ آنکھوں سے معذور تھا۔ میلا پیوند لگا ہوا پاجامہ پہنتا تھا۔ پاؤں میں ٹوٹی ہوئی جوتی تھی۔ الجھے ہوئے بال تھے۔ سر پہ ایک پھٹی ہوئی ٹوپی رکھی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بانس کی اونچی سی لکڑی ہوتی تھی اور دوسرے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ کئی مہینے کی بیماری کے بعد آج ہی اٹھا ہے۔ وہ داہنے پاؤں کو گھسیٹ کر چلتا تھا شاید ایسے کبھی فالج ہو گیا ہوگا۔ یہ فقیر شہزادہ کسی دکان یا کسی شخص کے سامنے نہیں ٹھہرتا تھا۔ اگر کسی راہ گیر یا دکان دار کو رحم آ جاتا تو وہ اس کے پیالے میں پیسہ ڈال دیتا تھا۔فقیر شہزادہ جواب میں یہ کہتا تھا کہ بھلا ہو بابا خدا تم کو براوقت نہ دکھائے۔ آنکھوں کی معذوری کی وجہ سے وہ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کو خیرات دینے والا کون تھا اور خود یہ فقیر شہزادہ کون تھا،حسن نظامی یہ بتاتے ہیں کہ وہ بہادر شاہ کا حقیقی نواسہ تھا اور اس کا نام مرزا قمر سلطان تھا۔

۱۸۵۷ء کے موضوع پر اگر ہم اورل ہسٹری کے حوالے سے مصادر دیکھنا چاہیں تو اس میں خواجہ حسن نظامی کی بارہ کتابیں موجود ہیں۔ جن میں غدر کے اخبار، بیگمات کے آنسو، انگریزوں کے قصے، محاصرہ دہلی کے خطوط،غدر کے فرمان، دلی کی جانکنی، بہادر شاہ کا روزنامچہ، غدر کے صبح و شام قابل ذکر ہیں۔

سن ستاون کی اورل ہسٹری پر خطوط کی شکل مین ایک قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔ اس ذخیرے میں مرزا غالب کے وہ درد بھرے خطوط ہیں جن میں دلی کی تباہی پر آنسو بہائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ دلی میں انگریزوں کے پھیلائے ہوئے نیٹورک میں

Scanned by CamScanner

کام کرنے والے مقامی جاسوسوں کے خطوط کی خاصی مقدار موجود ہے۔ یہ جاسوس پابندی کے ساتھ دلی کی پہاڑی پر چھاؤنی میں بہادر شاہ کے دربار اور مقامی سپاہ اور افسروں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرتے تھے۔ انگریزوں نے ۱۸ ستمبر کو جو آخری فیصلہ کن حملہ کشمیری دروازے کی فصیل پر کیا تھا اس حملے سے قبل انہوں نے مقامی سپاہ کے توپ خانے اور ان کی فوجی قوت کے بارے میں اطلاعات ان ہی مقامی جاسوسوں کے ذریعے حاصل کی تھیں۔ ان جاسوسوں کے لکھے ہوئے خطوط کے ''غداروں کے خطوط'' کے مجموعے میں سلیم الدین قریشی مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں۔

سن ستاون پر کچھ خود نوشتیں بھی موجود ہیں۔ ان میں ظہیر دہلوی کی داستان غدر، غالب کی دستنبو، معین الدین حسن خاں کی خدنگ نظر، نواب غلام حسن خان کی دلی کی سزا قابل ذکر ہیں۔

سن ستاون کے لوگ گیت پی سی جوشی نے مرتب کیے تھے جو ان کی مرتب کردہ کتاب انقلاب اٹھارہ سو ستاون میں شامل ہیں۔ اسی طرح سے عتیق احمد صدیقی کی مرتب کردہ کتاب اٹھارہ سو ستاون۔ اخبارات و دستاویزیں بھی بہت قابل قدر ہے۔ اس کتاب کا سارا مواد نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے ذخیرے سے حاصل کیا گیا تھا۔

مندرجہ بالا مباحث سے یہ بات بہ خوبی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ تاریخ صرف جنرل ہسٹری ہی کا نام نہیں ہے۔ جنرل ہسٹری بلاشبہ بنیادی حیثیت کی حامل ہے اور تاریخی ماخذوں پر انحصار کے سبب اسے پورا پورا وقار حاصل ہے مگر جنرل ہسٹری کے بھی اپنے حدود ہیں، سرحدیں ہیں، یہ ہسٹری ان کے باہر قدم نہیں رکھ سکتی کیوں کہ تاریخ نویسی کے تقاضے اور ضابطے اس کی اجازت دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ لہذا جہاں پر جنرل ہسٹری اپنے ضابطوں کے باعث آگے قدم نہیں بڑھا سکتی وہاں اورل ہسٹری کا مواد یہ کردار ادا کرتا ہے۔ اورل ہسٹری اکثر اوقات تہذیب کی گم گشتہ ساعتوں کو روشن کرتی ہے اور

Scanned by CamScanner

سانحات کی بے جان نبضوں کو قوت اور حرکت دے کر سانحات کی تصویریں پیش کرتی ہے۔ اردو میں اورل ہسٹری پہ مناسب طور پر کام نہیں ہوا ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں اورل ہسٹری کے ماخذوں سے رجوع کر کے استفادہ کیا جائے اور اس تاریخ کے کردار کو تسلیم کیا جائے اس صورت میں یقیناً تاریخ کی نئی جہات ہمارے سامنے آ سکیں گی۔

❖•❖•❖ ❖•❖•❖ ❖•❖•❖

حوالے

1. A Global Encyclopeia of Histrial Writing Garland Publishing, Inc. New york. 1998.
2. Sherwani, H.K. Muhammad Quli Qutab Shah. Founder of Hyderabad(London: Asia Publishing House, 1967.)

۳۔ سید محمد لطیف، تاریخ لاہور (لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۴ء) ص ۲۶۰

۴۔ خواجہ حسن نظامی، بیگمات کے آنسو (لاہور: خواجگان پبلی کیشنز: س۔ن) ص ۱۴۔۱۳

۵۔ مذکورہ حوالہ ص ۱۰۸۔۱۰۷

Scanned by CamScanner